اسلام کی اخلاقی تعلیمات

محمد عبداللہ سلیم

انسان فطرتاً مدنی الطبع ہوتا ہے۔ قدرتی طور پر ہر انسان کی ضروریات ایک دوسرے سے وابستہ ہوتی ہیں، اس لئے خوشگوار اور آرام دہ زندگی اسی کی ہوتی ہے جس کی بود و باش افرادِ انسانی کے جھرمٹ میں ہو۔ اور اسی لئے یہ معاشرت باہم ایسے طریقِ کار کی محتاج ہوتی ہے جس میں زندگی کی خوشگواریاں ناخوشگواریوں سے تبدیل نہ ہوں۔ اور کوئی فرد حق تلفی اور بے اطمینانی کا شکار نہ ہو۔

اخلاق کی حقیقت

چونکہ یہ متوازن اسلوب جس میں امدادِ باہمی، اور آپسی امن و سکون ہو انسان کی فطری اور خلقی مدنیت و شہریت کے تقاضوں کے عین مطابق ہے، اس لئے اس اسلوب کے ہر پہلو اور طریقِ کار کے ہر جزو کو خلق کا نام دیا گیا۔ اس سے یہ بات بھی واضح ہو گئی کہ خَلق، خِلق اور خُلق کی حدودِ استعمال خواہ جداگانہ اور خاص ہوں لیکن مادہ کے اشتراک کی وجہ سے تینوں ایک ہی اصل سے مربوط ہیں۔ اس سے اخلاق کی اہمیت نمایاں ہو جاتی ہے اور یہیں سے یہ حقیقت بھی منکشف ہو جاتی ہے کہ جس طرح خَلق یعنی عملِ پیدائش کی نسبت اللہ کی طرف ہے کہ وہی خالق کل ہے، اسی طرح اخلاق کی تجویز و تعیین کی نسبت بھی اسی خالق کی طرف ہے اس لئے کہ خلق کے مناسب کون سے اخلاق ہو سکتے ہیں اس کا علم خالق سے بہتر اور کس کو ہو سکتا ہے، اور چونکہ ایسے اخلاق سب کے سب نہایت عمدہ اور محمود ہیں۔ اس لئے اپنے درجۂ کمال کے ساتھ وہی اخلاق خود خالقِ حقیقی کے بھی ہوا اخلاق ہیں کیونکہ وہ جامع کمالاتِ حقیقی ہیں، اس واسطے جب انسان کملے

یہ فرمایا گیا۔ ان اللہ خلق ادم علی صورتہٖ یعنی اللہ نے حضرت آدم علیہ السلام (سب سے پہلے انسان) کو اپنی صورت پر پیدا کیا ہے اور حضرات علماء نے "علی صورتہٖ" کا مفہوم "علی صفتہٖ" بتلایا ہے یعنی اللہ نے اپنی صفت اور خُلق پر ابوالبشر کی تخلیق فرمائی ہے، وہیں انسانوں کو صادق و مصدوق صلی اللہ علیہ وسلم کے ذریعہ یہ ہدایت بھی فرمائی گئی تخلقوا باخلاق اللہ (حدیث) یعنی اپنے اندر اللہ کے اخلاق پیدا کرو اور اپنے اخلاق کو اس کے اخلاق کے مطابق بناؤ۔

یہیں یہ بات بھی روزِ روشن کی طرح عیاں ہوگئی کہ جب اخلاقِ حمیدہ فطرت کے مطابق ہونے کے ناطے خالقِ فطرت کی طرف سے ہوئے تو یہ اس مذہب کا حصہ بلکہ عنوان ہوئے جو فطری ہے اور اس کا طول و عرض اور فوق و تحت غرض سب پہلو خالقِ فطرت نے تشکیل دیئے ہیں، جس کا نام اسلام ہے، اور اسی لئے یہ مذہب بشمولِ اخلاق ہمیشہ کے لئے اور ناقابلِ تغیر ہے، اس لئے کہ فطرت بدلا نہیں کرتی۔ فطرۃ اللہ التی فطرالناس علیھا لاتبدیل لخلق اللہ [1] (القرآن)

پھر یہ اخلاقِ حمیدہ جو فطری مذہب کا حصہ اور خود فطری ہیں، انسان کے کسی بھی فطری جذبہ اور خلقی تقاضے کو نہ پامال کرتے ہیں اور نہ متصادم ہوتے ہیں بلکہ ان کا صحیح مصرف متعین کر دیتے ہیں، لہٰذا اچھے اخلاق کے یہ معنی قطعاً نہیں ہیں کہ انسان کو غصہ ہی نہ آئے، اور کلیۃً غصہ ختم ہو جائے، غصہ اور غضب فطری تقاضا ہے یہ ختم نہیں ہو سکتا تو فطری مذہب میں اس کو ختم کرنے کا حکم ہرگز نہیں دیا جا سکتا، ہاں مذہب نے اس کے استعمال کے ایسے مواقع متعین کر دیئے جہاں استعمال کرنے سے انجام کار سب کا نفع ہو، یعنی ایسے کاموں کے مقابلہ میں غضب اور غصہ کو لایا جائے جو حقیقتاً شر اور برائی کا سرچشمہ ہوں۔ فطری مذہب نے ان کی برائی پر مہر ثبت کر دی ہو، ایسی برائیوں کو غضب اور غصہ کی آگ سے جلا دیا جائے تو پورے معاشرہ کو اس سے نفع ہوگا۔ غصہ کا یہ استعمال بجا ہے اور پسندیدہ ہے، اس کے برعکس اگر یہ غضب اور غصہ ناحق

یا اچھائیوں کے مقابلہ میں ہوگا تو اس میں معاشرہ کا نقصان ہے اس لئے وہ ناپسندیدہ اور مذموم ہے۔

چنانچہ قتل جو غضب اور غصہ کے انتہائی عروج کا نتیجہ ہوتا ہے، یہ ایک ہی عمل نوعیت کے تغیّر سے محمود بھی ہے اور مذموم بھی۔ اس کے لئے قرآن حکیم کی دو آیتوں کو ملاحظہ کیا جائے فرمایا گیا۔

من قتل نفسا بغیر نفس او فساد فی الارض فکانما قتل الناس جمیعًا ومن احیاھا فکانما احیا الناس جمیعًا۔ (۲)	جس نے ایک جان کو دوسری کسی جان کے بدلے کے بغیر یا زمین میں فساد کیلئے قتل کیا گویا اس نے ساری نوع انسانی کو قتل کر دیا۔ اور جس نے ایک جان کو زندگی بخشی گویا اس نے ساری نوع انسانی کو زندگی بخش دی

دوسری آیت میں اس طرح ارشاد ہوا۔

ولکم فی القصاص حیوۃ یا اولی الباب لعلکم تتقون (۳)	اور تمہارے لئے قصاص میں سامان حیات ہے اے عقل والو، کہ شاید تم اس برائی سے بچ جاؤ۔

دیکھئے پہلی آیت میں اس قتل کی مذمت آئی ہے جو ناحق ہے اور ناحق غصہ کا نتیجہ ہے۔ اس کا ثمرہ یہ ہے کہ یہ برائی پھیل جائے تو سب کی جانیں غیر محفوظ ہو جائیں گی جو پورے معاشرے کے لئے سخت نقصان دہ صورت ہے۔

اور دوسری آیت میں قصاص یعنی ایسے قتل کا ذکر ہے جو ناحق قتل کرنے والے قاتل کے لئے بطور سزا اور تعزیر کے ظہور پذیر ہوا ہو، یہ قتل اس لئے سب کی سلامتی کا باعث ہے کہ اس سے ناحق قتل کے راستے مسدود ہوتے ہیں، جو پورے معاشرے کے لئے نافع ہوگا، لہٰذا یہ قتل قصاص بھی پسندیدہ ہے اور جس غضب اور غصے کے ذریعہ یہ قتل ہو وہ بھی پسندیدہ ہے، کیونکہ صحیح مصرف میں اس کا صرف ہوا ہے۔

آخر قہر وغضب اللہ تعالیٰ کی صفت ہے تو وہ مذموم کیسے ہوسکتی ہے؟ مگر اس کی شانِ غضب جن بدبختوں کے حق میں ظاہر ہوگی، ان پر غضب کا ہونا اس لئے محمود ہے کہ یہی بات نیکوکاروں کے حق میں فضل وکرم کا موجب ہوگی اس لئے کہ غضب کے مستوجب پر غضب اور فضل کے مستحق پر فضل فرمانا ہی کمالِ عدل ہے۔

اسی طرح انسان میں فطری طور پر شہوانی خواہش رکھی گئی ہے، تو اس کی تکمیل مطلقاً مذموم نہیں ہے۔ بلکہ اگر منکوحہ بیوی سے جائز اوقات میں اس تقاضے کو پورا کیا جائے، تو یہی عمل محمود ہے، محل اور زمان کی قید ختم کر کے شہوت رانی ہو تو یہ مذموم اور قابل تعزیر بدخُلقی ہے اسی پر جھوٹ، حرص، غیبت، تجسس، تحصیلِ مال وغیرہ امور کو قیاس کر لیا جائے۔ کہ نوعیتوں کے فرق سے یہ سب چیزیں حُسنِ خُلق بھی بن سکتی ہیں اور بدخُلق بھی۔

حاصل یہی ہے کہ فطری مذہب کی اخلاقیات نے انسانی جذبات کو پامال نہیں کیا کہ یہ بات خلافِ فطرت ہوتی، بلکہ ان کا صحیح مصرف متعین کیا ہے لہٰذا صحیح موقعوں پر اگر جذبات کو کام میں لایا جائے تو یہ عین اخلاق ہے، اس لئے کہ اس صورت میں نقصان نہیں بلکہ معاشرہ کا فائدہ ہے۔

مراتب اخلاق

یہی وجہ ہے کہ مفادات ومصالح کی درجہ بندی کی وجہ سے اخلاق میں بھی فرقِ مراتب ہوئے۔ پہلا درجہ خُلقِ حسن کا ہے۔ جس کا حاصل یہ ہے کہ برائی کا بدلہ اسی جیسی برائی سے دے دیا جائے۔ جیسا کہ قرآن حکیم میں قانون بتلایا گیا۔

ان النفس بالنفس والعين بالعين	بلاشبہ جان کے بدلے جان اور آنکھ کے بدلے آنکھ
والانف بالانف والاذن بالاذن	اور ناک کے بدلے ناک اور کان کے بدلے کان اور
والسن بالسن والجروح قصاص (۲)	دانت کے بدلے دانت اور دوسرے زخموں میں قصاص ہے

اور دوسرا درجہ خُلقِ کریم ہے، جس کا مطلب یہ ہے کہ برائی کا بدلہ نہ لیا جائے بلکہ معاف

کردیا جائے۔

اور تیسرا درجہ "خُلق عظیم" ہے جس کے معنی یہ ہیں کہ برائی کرنے والے کو نہ صرف یہ کہ معاف کردیا جائے، بلکہ اس کے اصلاح حال کی فکر بھی کی جائے تاکہ آئندہ اس سے برائی سرزد نہ ہو اس طرح جب خود برائی کرنے والا درست ہو جائے گا تو اس سے معاشرے میں برائی پھیلنے کا جو خطرہ تھا وہ خود بخود ختم ہو جائے گا۔

قرآن حکیم کی ایک آیت میں اخلاق کے ان تینوں درجوں کو یکجا اس طرح فرمایا گیا ہے۔

وجزاء سیئۃ سیئۃ مثلھا فمن عفا واصلح فاجرہ علی اللہ (۵)

برائی کا بدلہ اسی جیسی برائی ہے مگر جس شخص نے معاف کردیا اور مجرم کی اصلاح میں لگ گیا تو اس کا اجر اللہ کے ذمہ ہے

ظاہر ہے کہ "خُلق عظیم" اخلاق کا بلند ترین درجہ ہے۔ قرآن حکیم ہی کی یہ شہادت بھی ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم اخلاق کے اسی بلند مرتبہ پر فائز تھے۔

وانک لعلی خلق عظیم (۶)

پیغمبر (صلی اللہ علیہ وسلم) آپ بلاشبہ خلق عظیم کے مرتبہ پر ہیں

غور کیا جائے تو اس سے یہ بنیادی نکتہ نکلتا ہے جو ساری اخلاقیات کا اصل الاصول ہے کہ کوئی کتنا بڑا ہی مجرم اور بد اخلاق کیوں نہ ہو اس کی طرف سے ہمدردی اور اخوت کے جذبات ختم نہ ہونے چاہئیں جس کا حاصل یہ ہے کہ قابل نفرت چیز بدی اور برائی ہے، نہ کہ اس کا مرتکب اس لئے کہ اس میں اس برائی کے علاوہ کچھ خوبیاں بھی تو ہیں جو قابل تعریف ہوتی ہیں۔ دیکھئے جس میں جسمانی عیوب ہوں ان عیوب و مصائب کے بارے میں تو یہ تعلیم دی گئی کہ خود ان سے محفوظ رہنے پر اللہ کا شکر ادا کیا جائے کہ اس نے اس مصیبت سے بچایا۔ حدیث میں یہ دعا اس طرح ہے۔

الحمد للہ الذی عافانی

تمام تعریفیں اسی اللہ کیلئے ہیں جس نے اس مصیبت سے

مما ابتلاک بہ ۔۔۔ نجات دلائی جس میں یہ مبتلا ہے ۔

یہ مصیبت ناپسندیدہ نہ ہوتی تو اس سے محفوظ رہنے پر اللہ کے شکر کی کیوں ہدایت دی جاتی

معلوم ہوا کہ عیب اور مصیبت اپنی ذات سے ناپسندیدہ ہے ۔

مگر اس کے برعکس جو اس عیب اور مصیبت میں مبتلا ہے ، اس کی ادنیٰ درجہ کی رسوائی اور تضحیک تک سے منع کیا گیا ہے ۔ چنانچہ قرآن حکیم میں ہے ۔

یاایها الذین امنوا لا یسخر قوم من قوم عسیٰ ان یکونوا خیراً منهم ولا نساء من نساء عسیٰ ان یکن خیراً منهن الخ (۷)	اے ایمان والو کوئی قوم کسی قوم کا مذاق نہ اڑائے کیونکہ ممکن ہے وہی قوم ان سے بہتر ہو اور نہ عورتیں دوسری عورتوں کا مذاق اڑائیں اس لئے کہ ممکن ہے کہ وہی ان سے (خدا کے نزدیک) بہتر ہوں ۔

اس سے واضح ہے کہ ناپسندیدہ عیب اور مصیبت ہے نہ کہ اس میں مبتلا افراد و اشخاص ۔ تو جس طرح جسمانی عیوب اور خلقی مصائب مبغوض ہیں ، نہ کہ ان میں مبتلا افراد ۔ اسی طرح اخلاقی برائیاں فی نفسہ قابل نفرت ہیں نہ کہ ان کے مرتکب اشخاص ، بلکہ ان سے بدستور اخوت اور ہمدردی کا معاملہ کیا جاتا رہے گا اور اس اخوت کے تقاضے پورے کئے جاتے رہیں گے ۔

انما المؤمنون اخوة فاصلحوا بین اخویکم (۸)	بلاشبہ سب مسلمان بھائی بھائی ہیں ، لہذا اپنے بھائیوں کے درمیان اصلاحِ احوال اور ہمدردی کا معاملہ کرو ۔

باہمی اخوت کی اساس

ہمدردی کے ساتھ اصلاح حال کا یہ عمل کوئی انسان اس وقت تک نہیں کر سکتا جب تک کہ اپنی جان کی طرح دوسرے کی جان کو اور اپنے مفاد کی طرح دوسرے کے مفاد کو عزیز نہ سمجھے ۔

دوسرے کے جان و مال کو اپنے جان و مال کی طرح عزیز سمجھنے کی ہدایت قرآن حکیم کی ایک آیت کے اندازِ بیان سے مفہوم ہوتی ہے۔ سورۂ نساء میں فرمایا گیا۔

یاایھا الذین امنوا لا تاکلوا اموالکم بینکم بالباطل الا ان تکون تجارۃ عن تراضٍ منکم و لا تقتلوا انفسکم (۹)

اے ایمان والو نہ کھاؤ تم اپنے مال آپس میں باطل طریقہ پر مگر یہ کہ باہمی رضامندی سے تجارت کے طریقہ پر ہو اور نہ ہلاک کرو تم اپنی جانوں کو۔

اور جب کوئی شخص دوسرے کی جان و مال اور عزت و آبرو کو اپنی جان و مال و عزت کی طرح سمجھے گا، تو پھر جس طرح انسان یہ چاہتا کہ مجھ میں عیب اور برائی تو نہ ہو لیکن اگر ہے بھی تو لوگ مجھے ذلیل و رسوا نہ کریں، اور میرے ساتھ کسی طرح کی بدمعاملگی نہ ہو۔ تو یہی بات وہ دوسرے کے لئے بھی چاہے گا کہ اس میں موجود برائیوں سے تو نفرت کرے گا۔ لیکن اس شخص سے نفرت و حقارت کا معاملہ نہ کرے گا، اور یہی بات ایمان کی خوبی کی ہے، جیسا کہ حدیث میں فرمایا گیا۔

لایومن احدکم حتّٰی یحبّ لاخیہ مایحبّ لنفسہ

تم میں کوئی کامل ایمان والا نہیں ہو سکتا جب تک کہ اپنے بھائی کیلئے اسی بات کو پسند نہ کرنے لگے جو اپنی ذات کیلئے پسند کرتا ہے۔

اخلاق کا پہلا اصول

معاشرتی اخلاق کی ایک اصل جو سب سے زیادہ بنیادی ہے یہ معلوم ہوئی کہ اپنائیت کے جذبے سے سرشار ہو کر باہمی اخوّت اور ہمدردی کا برتاؤ ہونا چاہیئے۔ ظاہر ہے کہ یہ خوبی اگر معاشرہ میں رچ بس جائے، تو سب کے حقوق نہ صرف یہ کہ محفوظ ہو جائیں گے۔ بلکہ ان کی ادائیگی بھی ہونے لگے گی۔

اخلاق کا دوسرا اصول

مندرجہ بالا بات سے دوسرا اصول یہ نکلا کہ خود کو دوسروں سے بلند و بالا نہ سمجھے بلکہ یہ خیال کرے کہ اگر فلاں فلاں میں یہ عیب ہیں تو مجھ میں بے شمار عیوب اور خرابیاں ہیں۔ ضروری

نہیں ہے کہ میں ان سے باخبر ہی ہوں، ہو سکتا ہے کہ میں جن باتوں کو اپنے اندر برا نہیں سمجھتا دوسرے لوگ اس کو برا سمجھتے ہوں، چنانچہ مثل مشہور ہے کہ دوسرے کی آنکھ کا تنکا نظر آتا ہے، اپنی آنکھ کا پہاڑ نظر نہیں آتا۔ معاشرے میں فتنہ و فساد اسی سے پیدا ہوتے ہیں کہ لوگ خودنمائی اور خودستائی اور دوسروں کی تحقیر و تذلیل و تضحیک میں لگے رہتے ہیں اور اس سے آخرکار لڑائی جھگڑے بھڑک اٹھتے ہیں۔

اسلامی تعلیمات میں غور و فکر سے ان دو اصولوں کے علاوہ اخلاقیات کے باب میں ایک اصول اور سامنے آتا ہے

اخلاق کا تیسرا اصول

انسان خود کو زندگی کے معاملات اور آپسی امور میں مادر پدر آزاد نہ سمجھے جس سے بے فکری پیدا ہوتی ہے، جس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ کسی جگہ اگر برائی سر ابھارتی ہے تو لوگوں کی غفلت کی وجہ سے وہ پھلتی پھولتی رہتی ہے۔ اور برگ و بار لے آتی ہے اور اس طرح پورا معاشرہ اس کی لپیٹ میں آجاتا ہے۔ اگر لوگ بے فکری اور غفلت میں نہ پڑے ہوتے، اور بروقت فکر کرکے اور یہ سمجھ کر کہ برائی اگرچہ ہماری ذات سے سرزد نہیں ہو رہی ہے۔ لیکن پھر بھی اس برائی کو دور کرنا ہماری ذمہ داری ہے وہ اس برائی کا علاج تجویز کرتے تو یہ برائی شروع ہی میں دفن ہو جاتی اور اس طرح معاشرہ اس کی زد سے محفوظ ہو جاتا۔

اس بارے میں اسلامی تعلیم یہ ہے

الا کلکم راع و کلکم مسئول عن رعیتہ — یاد رکھو تم میں ہر شخص نگہبان ہے اور اپنی زیر نگرانی رہنے والوں کی طرف سے جوابدہ ہے۔

بلاشبہ ہر شخص میں اگر ذمہ داری کا یہ احساس پیدا ہو جائے کہ خاندان محلہ اور شہر غرض

پورے معاشرے کی برائیوں کو دور کرنے کا میں اسی طرح مکلف ہوں جس طرح اپنی ذات کی برائیوں کو دور کرنے کا پابند ہوں۔ تو فساد اور بد خلقی کو پنپنے کا راستہ نہیں ملے گا۔ اس لئے کہ ہر شخص اصلاح کی ذمہ داری کو ادا کرتا ہو گا۔ فساد تو معاشرے میں اس لئے پھیلتا ہے کہ اس کو پھیلانے والوں پر کوئی روک ٹوک نہیں، اور نہ ان کے راستہ میں کوئی رکاوٹ ہے۔ ظاہر ہے یہ مسؤلیت اور جوابدہی قیامت کے دن ہی ہوگی، تو اس کا حاصل یہ ہے کہ لوگوں میں فکر آخرت کا پیدا ہونا اخلاقیات کی ایک اہم بنیاد اور بنیادی اصل قرار پائی۔ یہ بھی ظاہر ہے کہ فکرِ آخرت اس وقت تک پیدا نہیں ہو سکتی جب تک اللہ اور اس کے رسول (صلی اللہ علیہ وسلم) پر ایمان اور یقین درست نہ ہو۔ اللہ پر ایمان اس لئے کہ وہی خالق و مالک ہے وہی خیر کا سرچشمہ ہے اور اسی نے خیر کا حکم دیا ہے، اور پھر وہی روزِ جزا کا مالک ہونے کی حیثیت سے روزِ جزا ہم سے خیر و شر کے بارے میں جواب طلب کرے گا، ہم اس کی مخلوق اور بندے ہیں۔ ہم جوابدہی پر مجبور ہوں گے۔

اس کے علاوہ اس بات پر ایمان بھی ضروری ہے کہ پیغمبر کی ذات (صلی اللہ علیہ وسلم) خیر کا مظہر، خیر کے اعمال کا مکمل نمونہ، اور اس کے اصول و فروع کے کامل مبلغ ہیں لہذا ان پر یقین اور ان کی اطاعت ہی سے خیر حاصل ہوگی، اس لئے کہ شروع میں بتلایا جا چکا حسن اخلاق اللہ کی صفات کے مظاہر ہیں اور چونکہ اس کی ذات کی طرح صفات و اخلاق کا علم بواسطہ پیغمبر ہی ملا ہے۔ اس لئے حسن اخلاق اس پیغمبر اور اس کی تعلیمات سے ربط و تعلق کے بغیر نہ قابل اعتماد ہے اور نہ لائق اعتبار۔

اخلاقی نفاق و اخلاص

آخرت اور اس کی جوابدہی سے بے فکر لوگ ایک دوسرے کی دیکھا دیکھی۔ کچھ اصول وضع

کر کے اپنے اقوال و افعال میں بظاہر تو اخلاق کا رنگ پیدا کر سکتے ہیں، مگر حقیقتاً با اخلاق نہیں بن سکتے۔ جیسا کہ آج کل یورپ اور امریکہ کا حال ہے کہ بظاہر تو ان کے یہاں معاشرتی اخلاق ہیں اور وہ ان پر کسی درجہ میں عمل بھی کرتے ہیں، لیکن جہاں ان کو موقع ملتا ہے تو ذرا سی دیر میں وہ ان اخلاقی بندھنوں سے آزاد ہو جاتے ہیں یہی وجہ ہے کہ وہ ایشیائی قوموں سے نفع اندوزی کے باوجود ان کا برابر استحصال کرتے رہتے ہیں، اسی طرح کچھ عرصہ قبل نیویارک میں بجلی فیل ہوئی تو سینکڑوں، ہزاروں قتل ہو گئے، اور ہزاروں کی عزت و آبرو لٹ گئی، واقعہ یہ ہے کہ یہ قومیں نفاق کا شکار ہیں، اگر ان کے اخلاق میں اخلاص ہوتا تو آج دنیا جنت کا نمونہ بن جاتی، مگر سائنس و ٹیکنالوجی کی اعلیٰ ترقیات کے باوجود دنیا جہنم بنی ہوئی ہے۔ ہر شخص نفسا نفسی میں گرفتار ہے۔ اور ہر فرد مبتلائے عذاب ہے۔

خلاصۂ بحث

اب بحث کو سمیٹ لیا جائے تو اصول اخلاق کی ترتیب اس طرح بنتی ہے۔

۱۔ اللہ اور اس کے رسول پہ ایمان

۲۔ فکر آخرت، اور وہاں کی جوابدہی اور اپنی مسئولیت کا احساس

۳۔ اپنے کو برتر اور دوسروں کو کم تر نہ سمجھنا۔

۴۔ باہمی اخوت و ہمدردی پر اس طرح عمل کرنا کہ اپنے مفاد کی طرح ہی دوسروں کا مفاد عزیز ہو۔

▲▲▲▲▲

حوالہ جات

۱ - الروم ۳۰

۲ - المآئدہ ۳۲

۳ - البقرہ ۱۷۹

۴ - المآئدہ ۴۵

۵ - الشوریٰ ۴۰

۶ - القلم ۴

۷ - الحجرات ۱۱

۸ - الحجرات ۱۰

۹ - النسآء ۲۹